پاکستان کی معاشی تاریخ

پروفیسر ساجد علی *

Abstract

The article as the title suggests is about Pakistan's economy. The author has discussed it from 1947 to 2005. Pakistan from its birth has faced many challenges but still it progressed. Some time it was enviable and at others it was lamentable. Pakistan faced number of calamities, at the time of birth there was influx of refugees, lack of funds to run the government, water and Kashmir dispute with India. These problems affected its economy adversely. Then wars were fought with India on Kashmir issue. In, 1971 one part of Pakistan was dismembered. This affected Pakistans economy to the core.

Pakistan faced natural disaster as well as man made disasters. Man made catastrophe poor structure of water catchments areas, East Pakistan debacle was also man made. Not investing on human resource development due to lack of interest also depict man made tragedies. The economy of Pakistan in spite of its entire limited infrastructure is still progressing. Its inertia for development is immense. The foremost task of the middle class should be to invest in human resource development i.e., education and health. Why these liabilities fall on middle class? As we know upper class is attracted to

---

* ۶۱، جی ایٹ / ون، اسلام آباد۔

money, they move and invest where they are sure to gain profit.

The poor are marginalized strata of society. For them keeping their body and soul intact is a test.

The middle class is the backbone of a nation. They have to work out ways so that people can survive with dignity and honour. They are the ones who feel the pain and strive to make ways for others.

وہ خطہ جو آج پاکستا ن کہلاتا ہے پانچ ہزار سال پہلے وادی سندھ کی قدیم تہذیب کا علاقہ تھا۔ اس تہذیب کے کھنڈرات ہڑپہ اور موہنجوداڑو کے مقامات پر آج بھی موجود ہیں۔ قدیم کھنڈرات کے مطالعے سے پتہ چلتا ہے کہ اگرچہ اس زمانے میں کچھ شہری آبادی بھی تھی لیکن زیادہ آبادی کا تعلق دیہی علاقوں سے تھا۔ زیا دہ تر لو گو ں کی معیشت کا تعلق زارعت کے شعبے سے تھا یعنی اکثر یت کسان تھی۔ کسا ن کے بعد کچھ لوگ جولاھا، نائی، موچی، لوھار، سناراورحکیم وغیرہ کے طور پر بھی کام کرتے تھے۔ اس وقت ایک مشترکہ خاندان کا تصور موجود تھا جس کے تحت ایک خا ندان کے لوگ اپنے وسا ئل یکجا کر کے خاندان بھر کیلئے آمدنی حاصل کرتے تھے۔ ضرورت سے زائد پیداوار کے بدلے دیگر اشیاء و خدمات حاصل کی جاتی تھیں۔ خاندان کی نوجوان نسل محنت کرتی تھی اور خاندان کے بوڑھوں، بچوں اور اپاہج لوگو ں کی کفا لت اسی کے ذمہ تھی۔۱

۳۲۱ تا۱۸۵ قبل مسیح موریہ دورتھا۔ اس دور میں براہ راست تبا دلے کی جگہ زر کے بدلے مال کے تبادلے کا آغاز ہو ا یعنی سکے گردش کرنے لگے۔ موریہ دور میں ہندوستا ن بھر میں سڑکو ں کی تعمیر پر تو جہ دی گی اور سفر کو لٹیر وں سے محفوظ کر نے کی بھی کوشش کی گئی اس کے نتیجے میں نہ صر ف علاقائی تجا رت کو فروغ ملا بلکہ عالمی تجا رت بھی ہو نے لگی۔ ہندو ستا ن سے بر آمد کی جا نے والی اشیاء میں ململ کا کپڑا، شا لیں دھا تی کام، ریشم گر م مصا لحے اور کچھ نما ئشی اشیا ء شامل تھیں جبکہ درآمد کی جانے والی اشیاء میں موتی،سونا، چاندی اور کچھ دیگر اشیاء شامل تھیں۔ اِس دور میں آبادی کی اکثریت ہند و مت یا بدھ مت سے تعلق رکھتی تھی۔۲

اسلام اس خطہ میں ۷۱۲ء میں متعا رف ہوا جب محمد بن قا سم نے سند ھ پر حملہ کیا۔

اس نے نہ صرف سارا سندھ بلکہ پنجاب میں ملتان تک کا علاقہ فتح کیا۔ کچھ عرصہ بعد وہ اپنے علاقے کی طرف لوٹ گیا[۳] لیکن اس کی آمد سے اسلام نے اس خطے میں جڑیں پکڑ لیں۔ مسلمانوں کی آمد کا سلسلہ اس وقت شروع ہوا جب ۱۰۰۱ء میں محمود غزنوی نے ہندوستان پر باقاعدہ حملوں کا آغاز کیا۔ اس کے ساتھ ہی صوفیاء کی آمد کا سلسلہ شروع ہوا اور اسلام فروغ پانے لگا۔ غزنوی کے بعد غوری اور غوری کے بعد سلاطین دہلی نے ہندوستان کو فتح کرنے کا عمل جاری رکھا حتی کہ ان کی جگہ مغل حکمرانوں نے لے لی۔ مغل دور ۱۸۵۷ء تک کسی نہ کسی شکل میں قائم رہا۔[۴]

مغل دور میں ہندوستان کو دنیا کی دوسری بڑی معیشت کا درجہ حاصل رہا۔ اورنگزیب عالمگیر کے دور میں اسے دنیا کی سب سے بڑی معیشت کا درجہ بھی ملا۔ اس کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ ۱۷۰۰ء میں اس کی حکومت کی آمدنی ۱۰۰ ملین پاؤنڈ تھی جبکہ اس سال سارے یورپ کی مشترکہ حکومتی آمدنی اس کے مقابے میں نصف تھی۔ اورنگ زیب کی وفات کے بعد مغل سلطنت کمزور ہوتی چلی گئی۔ سکھوں اور مرہٹوں کی بغاوتوں کے علاوہ اسے انگریزوں کی مداخلت کا سامنا بھی کرنا پڑا۔ ۱۷۶۵ء میں مغل بادشاہ شاہ عالم کی حکومت تھی جس نے انگریزوں کی بڑھتی ہوئی مداخلت کو روکنے کی کوشش کی لیکن وہ اس میں کامیاب نہ ہو سکا۔ اسے بنگال، بہار اور اڑیسہ ایسٹ انڈیا کمپنی کے حوالے کرنا پڑے آخر کار انگریز دہلی پہنچنے میں کامیاب ہوگئے۔ ۱۸۵۷ء میں مغل سلطنت کا خاتمہ ہو گیا اور انگریز تمام ہندوستان کے حکمران بن گئے۔[۵]

اگرچہ مغلوں نے زراعت کے شعبے پر خاصی توجہ دی لیکن وہ دیگر شعبوں مثلاً صنعت و حرفت کو وہ توجہ نہ دے سکے جس کی ضرورت تھی۔ اسی زمانے میں یورپ میں صنعتی انقلاب برپا ہوا اور برطانیہ، فرانس اور جرمنی وغیرہ کی معیشتیں ہندوستان سے آگے نکل گئیں۔ ۱۸۵۷ء کے بعد ہندوستان برطانیہ کے نوآبادیاتی نظام کا حصہ بن گیا۔ برطانیہ کو ہندوستان کی معاشی حالت سدھارنے سے زیادہ اس بات میں دلچسپی تھی کہ یہ علاقہ اس کے صنعتی مال کی منڈی بنا رہے اور برطانوی صنعتوں کو ضروری خام مال فراہم کرتا رہے۔

اگرچہ انگریزوں نے ہندوستا ن کو ریلو ے ٹیلی گراف اور پکی سڑکوں کا تحفہ دیا لیکن ان باتوں کا اصل مقصد خام مال کی فراہمی اور اپنے صنعتی مال کی ترسیل تھا۔۶

انگریزوں نے مسلمانوں سے حکومت چھینی تھی اس لیے وہ ہندوستان کے مسلمانوں کو اپنا حریف سمجھتے تھے۔ انہوں نے مسلمانوں کو پسماند ہ رکھنے کی پالیسی پر عمل کیا۔ وہ علا قے جہا ں مسلمانوں کی اکثر یت تھی وہاں ترقیاتی کام نہ ہو نے کے برابر تھے۔ اس صورت حال کا ہندوؤں نے خوب فائدہ اٹھایا۔ انگر یزوں کے دور میں ایک متوسط ہندو طبقہ پیدا ہوا جس نے مغربی تعلیم حاصل کی اور تجارت، صنعت اور زراعت کے علاوہ سرکاری ملازمتوں میں بھی نمایاں مقام حاصل کرلیا۔ اس موقع پر مسلمان مذہبی رہنماؤں کا رویہ بھی مسلمانوں کے لیے منفی ثابت ہوا کیونکہ وہ اُن کو مغربی تعلیم حاصل کرنے یعنی ڈاکٹر اور اِنجینئر بننے سے روکتے رہے اور مسلمانوں کو صرف مذہبی تعلیم پر توجہ دینے کا مشورہ دیتے رہے اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مسلما ن عام طور پر معیشت کے معا ملات میں بہت پیچھے رہ گئے۔۷

مسلمانوں اور ہندوؤں میں صدیو ں کا میل جول تھا لیکن انگریزوں کے دور میں ان کے باہمی تضادات نمایاں ہونے لگے۔ جب انڈین نیشنل کانگر یس نے آزادی کے لئے پُرامن جدوجہد کا آغاز کیا تو مسلمانوں کو احسا س ہوا کہ جمہوریت کے نام پر انھیں ہندوں کا غلام بنا دیا جائے گا۔ چنانچہ اپنے حقوق کے تحفظ کے لیے انھوں نے ۱۹۰۶ء میں مسلم لیگ کے نام سے ایک الگ سیاسی جماعت بنا لی۔ وقت گذرنے کے ساتھ جب قانون ساز ادارو ں میں مسلمانوں کو ان کے حق سے کم نمائند گی دی گئی تو دو قومی نظریہ نے فر وغ پایا اورمسلم لیگ کومسلما نو ں میں بہت مقبولیت حا صل ہو گئی۔ ۸

علامہ اقبال نے خطبہ الہ آباد ۱۹۳۰ء میں مسلمانوں کو الگ ملک بنا نے کا مشورہ دیا جس کی روشنی میں مسلم لیگ نے ۱۹۴۰ء میں قرارداد پاکستان پیش کی اور پاکستا ن حا صل کرنے کے لیے جدوجہد شروع کر دی اسی دوران انگریزوں کو دوسری عالمی جنگ لڑنا پڑی اور اس کے خاتمے پر انہوں نے اپنے نوآبادیاتی نظام کوختم کرنے کا فیصلہ کیا۔ ۱۹۴۷ء میں

ہندوستا ن کو آزادی دی گئی تو اس کو تقسیم کر کے پاکستان بھی قائم کر دیا گیا۔ ۹

جب انگریز اقتدار کا خاتمہ ہوا تو اس وقت ہندوستان کی معیشت دنیا کی غریب ترین معیشتوں میں سے ایک تھی۔ یہا ں صنعتی ترقی محدود تھی اور زراعت کیلئے قدیم طریقہ کاشتکا ری کی وجہ سے اپنی آبادی کو خوراک فراہم کرنا بھی مشکل تھا۔ خاص طور پر وہ علاقے جو مشرقی پاکستا ن اور مغربی پاکستان کے حصے میں آئے وہ ہندوستان کے دیگر علاقوں کی نسبت کہیں زیادہ پسما ندہ تھے۔ اس کی وجہ یہی تھی کہ مسلمانوں سے رنجش ہونے کے باعث انگریزوں نے ان علاقوں میں صنعت، ذرائع آمد و رفت، ذرائع رسل و رسائل اور مالی اداروں کے قیا م کو جان بوجھ کر نظر انداز کیا تھا۔۱۰

۱۹۴۷ء میں ہندوستان کی جو تقسیم کی گئی اس کے کئی معا شی مصارف تھے۔ اوّل مہاجروں کی آبادکاری کا مسئلہ تھا۔۱۱ دوسرا یہ مسئلہ تھا کہ بہت سے خام مال جیسے مشرقی بنگال کی پٹ سن اور مغربی پنجاب کی روئی کے کارخانے ان حصوں میں تھے جو ہندوستان کے پاس چلے گئے تھے۔۱۲ اس موقع پر کشمیر، جو نا گڑھ اور حیدر آباد کے تنازعات بھی پیدا ہو گئے۔ جونا گڑھ اور حیدرآباد کے حکمران مسلمان تھے اور پاکستان سے الحا ق چاہتے تھے لیکن ہندوستا ن نے یہ کہہ کر ان پر قبضہ کر لیا کہ ان علاقوں میں ہندو آبادی کی اکثریت ہے۔ کشمیر کا معاملہ الٹ تھا۔ وہا ں حکمران ہندو تھا جبکہ آبادی مسلمان تھی پھر بھی ہندوستا ن نے یہ کہہ کر اس پر قبضہ کر لیا کہ حکمران ہم سے الحا ق چاہتا ہے۔ یہ صورت حال پاکستان کی نو زائیدہ مملکت کے لیے نا قابل قبول تھی چنانچہ آزادی کے فوری بعد اسے کشمیر کے مسئلہ پر ہندوستان سے جنگ کرنا پڑی۔ اقو ام متحدہ کی مداخلت پر جنگ بند کی گئی تو کشمیر کا کچھ حصہ پا کستان کو حاصل ہو چکا تھا جبکہ کچھ حصہ ہندوستان کے پا س رہ گیا تھا۔ یہ مسئلہ آج تک حل طلب ہے۔۱۳

اس کے علاوہ تقسیم پنجاب کے ساتھ یہ مسئلہ وابستہ تھا کہ مغربی پنجاب کو سیراب کرنے والے دریا اور نہری پانی ہندوستان سے آتا تھا۔ ہندوستان کا دعوی تھا کہ یہ پانی اسکا ہے اور وہ اس میں پاکستان کو حصہ نہیں دے گا۔ آخر ۱۹۴۸ء میں یہ طے پایا کہ عا

رضی طور پر پاکستان کو پانی دے دیا جائے گا لیکن پاکستا ن کو چاہیے کہ آبپاشی کے متبادل ذرائع تلاش کرے۔[۱۴] تقسیم کے وقت یہ بھی طے پایا تھا کہ ہندوستان اپنے کُل اثاثوں میں سے ۷۵۰ ملین روپے حکو مت پاکستان کو دے گا لیکن ہندوستان نے یہ رقم یکمشت دینے کی بجائے قسطو ں میں ادا کی۔ پہلے بجٹ میں آمدنی کا تخمینہ ۱۵۰ ملین روپے لگایا گیا لیکن سرکاری ملازموں کی تنخواہوں کے لیے حبیب بنک سے قرض لینا پڑا۔

پاکستان کی حکومت کو ابتداء ہی میں اس قدر سیاسی اور دفاعی مسائل درپیش تھے کہ وہ معاشی معاملات کو وہ توجہ نہ دے سکی جس کی ضرورت تھی۔ ہندوستان میں تقسیم کے وقت ۱۴۰۰۰ سے زائد ایسے صنعتی ادارے تھے اور ہر بیسواں فرد ملازمت کرتا تھا۔ ان میں سے پاکستان کے حصے میں صرف ۱۴۰۰ ادارے آئے۔ اس کمی کا مطلب یہ تھا کہ وہ اشیاء جو ہندوستا ن میں بنتی تھیں اب پاکستان میں بنانا پڑیں گی۔ یہ پاکستانی سرمایہ کاروں کے لئے اچھی خبر تھی کیونکہ اس کا مطلب یہ تھا کہ وہ جو کچھ بھی پیدا کریں گے وہ باآسانی فروخت ہو جائے گا۔صنعتی اداروں کے فروغ کے لئے مالی ادارو ں کی موجودگی ضروری ہے۔ اس معاملے میں بھی پاکستان پسماندہ تھا۔ بڑے بڑے مالی ادار ے غیر مسلموں کی ملکیت تھے جو تقسیم کے ساتھ ہی اپنے اثاثے لے کر ہندوستان منتقل ہو گئے۔ پاکستان کے پاس صرف دو تجارتی بنک تھے۔ حبیب بنک اور مسلم کمرشل بنک تھے ،جبکہ مرکزی بنک کوئی نہیں تھا۔ سٹاک مارکیٹ اور دیگر مالی اداروں کے قیام کے لئے ضروری تھا کہ پہلے مرکزی بینک بنایا جائے چنانچہ قائداعظم کی خصوصی دلچسپی کے باعث یکم جولائی ۱۹۴۸ء کو بینک دولت پاکستان (State Bank of Pakistan) وجود میں آ گیا۔ اسی سال حکومت نے ایک ترقیاتی بورڈ بھی قائم کیا جس کا مقصد سرکاری شعبے میں ترقیاتی منصوبے تیار کرنا اور ان پر عمل درآمد کروانا تھا۔ کچھ عرصہ بعد اس کا نام قومی منصوبہ بندی بورڈ کر دیا گیا۔ [۱۵]

پاکستان میں سرمایہ کاری کے لئے ماحول سازگار تھا لیکن فنی ماہرین اور سرمایہ کی قلت تھی اس لئے سرمایہ کاری کی رفتار تسلی بخش نہیں تھی۔ چنانچہ یہ ذمہ داری بھی حکومت کو دی گئی کہ وہ ان مسائل کا حل تلا ش کرے۔ اس حوالے سے صنعتی ترقیاتی کارپوریشن

(PIDC) ۱۹۵۲ء میں قائم کی گئی۔[۱۶] اس کارپوریشن کا بنیادی مقصد یہ تھا کہ ایسی صنعتوں کا قیام عمل میں لایا جائے جہاں سرمایہ کار نجی سرمایہ کاری کرنے سے گھبراتا ہے۔ جب صنعتیں منافع بخش صورت اختیار کر لیں تو انھیں نجی سرمایہ کار کے حوالے کر دیا جائے۔ جہاں تک منصوبہ بندی کا تعلق ہے تو اس پر توجہ کافی عرصہ بعد دی گئی۔ فوری طور پر کولمبو پلان کے نام سے ایک منصوبے کو اختیار کر لیا گیا جو کہ دولت مشترکہ نے اپنے کچھ ایشیائی رکن ممالک کے لئے تیار کیا تھا۔ کولمبو پلان ۱۹۵۱ء تا ۱۹۵۶ء عرصہ کے لئے تھا۔[۱۷]

۱۹۵۱ء میں پاکستان کے پہلے وزیر اعظم لیاقت علی خان کو قتل کر دیا گیا۔ جس سے ملک بحران کا شکار ہو گیا۔ ۱۹۵۳ء کے آغاز میں خوراک کی کمی کا مسئلہ پیدا ہو گیا۔ اس موقع پر عوام احتجاج کرنے کے لیے سڑکوں پر آگئے۔ اس مسئلے کو امریکہ سے گندم لے کر پورا کیا گیا۔ رفتہ رفتہ بیرونی امداد کا کردار عام طور پر اور امریکی امداد کا کردار خاص طور پر بڑھتا چلا گیا۔

۱۹۵۰ء تا ۱۹۵۳ء کے عرصہ میں جنوبی اور شمالی کوریا کے درمیان ایک جنگ ہوئی جس میں روس نے شمالی کوریا کا اور امریکہ نے جنوبی کوریا کا ساتھ دیا۔ اس جنگ سے پاکستان کو بہت فائدہ ہوا۔ وہ اس طرح کہ اس کی برآمدی اشیاء مثلاً کپاس، پٹ سن، چمڑا، اور اون وغیرہ کے دام بہت بڑھ گئے۔ پاکستان کی معیشت پر ایک کتاب لکھنے والے پیٹر بلڈ کے الفاظ میں ''کوریا کی جنگ چھڑنے سے پاکستانی برآمدی اشیاء خوب مہنگی ہو گئیں اور کمزور معیشت کو سہارا مل گیا۔ نئے تجارتی رشتے قائم ہوئے اور کپڑے کے اور پٹ سن کے کارخانے کھولے جانے لگے''۔[۱۸]

کوریا کی جنگ جلد بند ہو گئی اور پاکستان کو درآمدات پر پابندیاں لگانا پڑیں تاکہ اپنی نوزائیدہ صنعتوں کو تحفظ دے سکے۔ ۱۹۵۶ء میں پاکستان نے اپنے پہلے آئین کا اعلان کیا اور گورنر جنرل کے عہدے کو صدر کے عہدے سے بدل دیا گیا۔ ۱۹۵۷ء میں صنعتی قرضے اور سرمایہ کاری کی کارپوریشن قائم کی گئی جس کا مقصد نہ صرف ملکی سرمایہ کاروں کو زرمبادلہ میں قرض دینا تھا بلکہ غیر ملکی سرمایہ کاروں کو پاکستان میں سرمایہ کاری کی ترغیب دینا

بھی تھا۔[۱۹] پاکستان کو اپنا پہلا پنج سالہ منصوبہ ۱۹۵۵ء تا ۱۹۶۰ء بنانا تھا لیکن مئی ۱۹۵۶ء تک اس کا ڈرافٹ بھی تیار نہ کیا جا سکا۔ حکومتوں کی بار بار کی تبدیلی کی وجہ سے یہ منصوبہ ۱۹۵۸ء میں شروع کیا گیا جبکہ اس کے تین سال بیت چکے تھے۔ اسی سال صدر اسکندر مرزا نے سیاسی حکومت توڑ کر مارشل لا لگا دیا اور آرمی چیف ایوب خان کو چیف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر لگا دیا۔ جنرل ایوب نے جلد اسکندر مرزا کو ہٹا کر خود صدر کا عہدہ سنبھال لیا۔[۲۰]

۱۹۵۸ء تا ۱۹۶۸ء کے عرصہ کو ایوب کے دور کے نام سے یاد کیا جاتا ہے سیاسی اعتبار سے یہ ایک آمرانہ دور تھا لیکن معاشی اعتبار سے یہ ایک سنہری دور تھا۔ ۱۹۵۹ء میں زرعی اصلاحات کی گئیں جن کے تحت آبپاشی والی زمین کی زیادہ سے زیادہ حد ۲۰۰ ایکڑ اور بارانی زمین کی حد ۴۰۰ ایکڑ مقرر کر دی گئی۔ حکومت کی غیر آباد زمین کھلے دل سے سرکاری اور فوجی افسران کو بانٹی گئی تا کہ وہ جدید طریقہ کاشتکاری اختیار کر کے زرعی پیداوار میں اضافہ کریں۔ آسان زرعی قرض اور دیہی علاقوں میں ترقیاتی کاموں کا آغاز اس کے علاوہ تھا۔ سب باتوں کو شامل کر کے کہا گیا کہ ملک میں سبز انقلاب برپا کر دیا گیا ہے۔ اگر چہ یہ بات بڑی حد تک درست تھی لیکن زرعی اصلاحات کا ایک مقصد جاگیردار طبقے کے سیاسی اثر و رسوخ کو کم کرنا بھی تھا کیونکہ یہی طبقہ جنرل ایوب کے لیے حزب مخالف کا کام کر رہا تھا۔ اس طبقے کے مقابلے میں ایک صنعت کار طبقہ لانے کے لیے صنعتی ترقی پر بھی خصوصی توجہ دی گئی۔ آسان شرائط پر قرض اور ٹیکس میں چھوٹ دینے کے علاوہ ایکسپورٹ بونس واؤچر اسکیم کا اجراء کیا گیا۔ اس اسکیم کے تحت صنعت کے لئے مشینری اور خام مال درآمد کرنے کے لئے زرمبادلہ فراہم کیا جاتا تھا۔ ۱۹۶۱ء میں صنعتی ترقیاتی بینک قائم کیا گیا اورسوتی کپڑے کی صنعت پر خصوصی توجہ دی گئی۔ ان تمام اقدامات سے واضح صنعتی ترقی دیکھنے میں آئی۔ مشہور معیشت دان روسٹو کے ماڈل کوسامنے رکھ کر کہا جا سکتا ہے کہ پاکستان نے دقیانوسی معاشرے کی سطح سے نکل کر فضا میں بلند ہونے کے لئے ضروری شرائط پوری کرلی تھیں اورایسا کہا جا رہا تھا کہ جلد وہ پرواز کے

مرحلے میں داخل ہو جائیگا۔ ۲۱

ایوب خان کے دس سالہ دور کو ترقی کا دور کہا جاتا ہے اور بلاشک و شبہ معاشی اعداد و شمار اس کی تصدیق کرتے ہیں۔ اس دور میں اوسطاً سالانہ ترقی کی شرح سات فیصد رہی جس کا مطلب ہے کہ ہماری خام قومی پیداوار دس سال میں چار گنا ہو گئی۔ ۲۲ ہم بھارت کے مقابلے میں زیادہ تیزی سے ترقی کر رہے تھے اور مشرق بعید کے اکثر ممالک سے بھی بہتر کارکردگی دکھا رہے تھے۔ تاہم اس کا یہ مطلب نہیں کہ ترقی کی داستان میں سب اچھا ہی اچھا تھا۔ اس میں کچھ منفی پہلو بھی موجود تھے۔ مثال کے طور پر ملک کی بیشتر دولت پر چند خاندانوں کا قبضہ ہو گیا۔ دولت کی تقسیم میں پیدا ہونے والے عدم توازن کو یہ کہہ کر جائز قرار دینے کی کوشش کی گئی کہ پہلے کیک بنا لیں اور پھر بانٹیں گے۔ اور یہ بھی کہ جلد ٹرکل ڈاؤن (trickle down) ہوگا اور سب کو فائدہ پہنچے گا۔ ایسا نہ ہوسکا اس دور میں زرعی شکل میں اجرتوں میں اضافہ ضرور ہوا لیکن قیمتوں میں اضافہ کو سامنے رکھا جائے تو حقیقی شرح اجرت ۲۵ فیصد کم ہوگئی۔ بیشتر صنعتی ترقی ملک کے مغربی حصہ میں ہوئی جس سے مشرقی حصہ میں احساس محرومی پیدا ہوا جس نے آگے چل کر بغاوت کی شکل اختیار کر لی۔ ۲۳

اجارہ داریوں کا قیام دیکھنے میں آیا اور حکومتی عہدیداروں اور سرمایہ داروں میں ایک ایسا گٹھ جوڑ ہوا جس کے اثرات شاید آج تک باقی ہیں۔ غیر ملکی امداد پر اس حد تک انحصار کیا گیا کہ قرضوں کی سروس جو ۱۹۵۸ء میں زر مبادلہ کی کمائی کا ۴.۵ فیصد تھی ۱۹۷۱ء تک زرمبادلہ کی کمائی کا ۳۴.۵ فیصد ہوگئی۔ ۲۴

۱۹۶۵ء کی پاک بھارت جنگ نے بھی معیشت کو بہت نقصان پہنچایا۔ جنگ کے بعد دفاع کو معاشی ترقی پر فوقیت حاصل ہوگئی اور وسائل کو دفاع اور ترقی کے درمیان تقسیم کرنا ایک مسئلہ بن گیا۔ مہنگائی کے مسئلہ نے عوام کو اتنا پریشان کیا کہ عوام حکومت کے خلاف کھلے عام احتجاج کرنے لگے۔ ایوب حکومت اپنے خلاف پیدا ہونے والے احتجاج کی شدت کم نہ کر سکی اور ایوب خان نے مستعفی ہونے کا فیصلہ کیا لیکن اقتدار آئین کے مطابق

قومی اسمبلی کے اسپیکر کو دینے کی بجائے فوج کو منتقل کر دیا۔[۲۵] ۱۹۶۹ء تا ۱۹۷۱ء کا دور ایک اور مارشل لاء کا دور تھا۔ اس دور کو جنرل یحییٰ کے دور کا نام دیا جاتا ہے۔ یحییٰ ایک نا اہل حکمران تھا۔ اس کے دور میں ملک آگے تو کیا جاتا، پچھلے دور سے بھی پیچھے چلا گیا۔ اس کے دور کی دو اہم باتوں میں ایک ملک میں انتخابات کا انعقاد تھا اور دوسری بھارت کے ساتھ ایک اور جنگ تھی جس کے نتیجے میں ملک دو لخت ہوگیا۔ دسمبر ۱۹۷۰ء میں ہونے والے انتخابات میں خلاف توقع نتائج دیکھنے کو ملے۔ پاکستان کی خالق جماعت مسلم لیگ بری طرح ہار گئی۔ مشرقی پاکستان میں مجیب الرحمٰن کی عوامی لیگ اور مغربی پاکستان میں ذوالفقار بھٹو کی پیپلز پارٹی دو بڑی جماعتوں کے طور پر سامنے آئیں۔ عوامی لیگ کو اتنی اکثریت حاصل تھی کہ وہ تنہا حکومت سازی کر سکتی تھی۔ مجیب الرحمان نے مشرقی پاکستان میں پیدا ہونے والی بے چینی کو ہوا دے کر کامیابی حاصل کی تھی۔ اس لیے مغربی پاکستان کے سیاستدان اور فوج اس کے بارے میں تحفظات رکھتے تھے۔ یحییٰ نے اقتدار اس کے حوالے کرنے کی بجائے اس کو بغاوت کے الزام میں گرفتار کر لیا۔ مشرقی پاکستان میں پہلے ہی یہ احساس موجود تھا کہ مغربی حصہ اس کے ساتھ سوتیلی ماں کا سا سلوک کرتا ہے۔ وہاں نفرت کا لاوا پھٹ پڑا اور کھلے عام بغاوت کا آغاز ہو گیا۔ بھارت نے موقع مناسب دیکھ کر بغاوت کی حمایت کا اعلان کر دیا اور پاکستان پر جنگ مسلط کر دی۔ یہ جنگ پاکستان ہار گیا۔ اس کے نتیجے میں نہ صرف مشرقی پاکستان بنگلہ دیش بن گیا بلکہ ۹۰ہزار پاک فوجی ہندوستان کی قید میں چلے گئے۔ دسمبر ۱۹۷۱ء یحییٰ خان نے استعفیٰ دے دیا اور مغربی پاکستان میں اقتدار ذوالفقار علی بھٹو کے حوالے کر دیا گیا۔[۲۶]

۱۹۴۷ء سے لے کر ۱۹۷۲ء تک سرمایہ داری نظام کے ماڈل کو اختیار کیا گیا تھا۔ اس نظام کی کچھ خامیوں مثلاً بے روزگاری، اجارہ داریوں کا قیام، افراط زر اور طبقاتی کشمکش سے عوام نالاں تھے۔ ان کے جذبات کو سامنے رکھ کر ذوالفقار علی بھٹو نے سوشلزم کی بات کی اور عوام کو روٹی، کپڑا اور مکان کا نعرہ دیا۔ عوام میں اسے مقبولیت حاصل ہوئی۔ اپنے بنیادی منشور کے مطابق ذوالفقار علی بھٹو نے بہت سے اقدامات کئے۔ اجارہ

داریو ں کو تو ڑنے کے لئے بہت سی صنعتوں کو قومی ملکیت میں لے لیا گیا۔ مراعات یافتہ امیر طبقہ کا زور توڑنے کے لیے انشورنس اور بینکا ر ی کے شعبے بھی قومی تحویل میں لے لیے گئے۔ ۱۹۷۲ء میں زرعی اصلاحات کی گئیں جس میں آبپاشی والی زمین کی حد ۱۵ ایکڑ اور بارانی زمین کی حد ۱۲ ایکڑ مقرر کردی گئی۔ یہ بھی اعلان کیا گیا کہ زائد زمین جو حکو مت کی ملکیت ہوگی اس کا کوئی معاوضہ نہیں دیا جائے گا۔ اس کے علاوہ مزارعوں کے حقوق کو تحفظ دینے کے لئے بھی کچھ اقدامات کا اعلان کیا گیا۔ بھٹو دور میں ۷۱،۰۰۰ ھا ریوں کو ۲،۸۵،۰۰۰ ایکڑ زمین مفت دی گئی۔ زراعت کی ترقی کیلئے زرعی بجٹ میں خاطرخواہ اضافہ کیا گیا۔ کیمیاوی کھاد، ٹریکٹر اور ٹیوب ویل کی حوصلہ افزائی کے لئے زرعی قرضہ کھلے دل سے دیا گیا۔ اس کے نتیجے میں زرعی پیداوار میں خاطر خواہ اضا فہ دیکھنے میں آیا۔[۲۷]

ایوب دور میں طویل مدت کے پنج سالہ منصوبوں کو اختیار کیا گیا تھا لیکن بھٹو کے خیال میں منصوبہ بندی کا یہ طریقہ ٹھیک نہیں تھا[۲۸] چنانچہ اسے ترک کردیا گیا۔ سالانہ بجٹ میں ترقیاتی کاموں کیلئے مخصوص بجٹ میں اضافہ کیا گیا۔ اس سے یہ مسئلہ پیدا ہوا کہ خسارے کی سرمایہ کاری جو ٦۰ کی دہائی میں بجٹ کا ۵ فیصد ہوا کرتی تھی وہ بھٹو دور میں بڑھ کر ۸ فیصد ہوگئی۔ اس نے مہنگا ئی کا مسئلہ پیدا کیا۔ مہنگائی کا مسئلہ اس وقت اورگھمبیر ہو گیا جب ۱۹۷۳ء کی عر ب اسرائیل جنگ کے بعد پٹرول کی قیمت میں اضافہ ہوا۔[۲۹] تجارتی خسارے کو کم کرنے کی غرض سے روپے کی قدر میں ۱۳۱ فیصد تخفیف کی گئی۔ اس نے بھی مہنگا ئی کو ہوا دی۔ اس وجہ سے وہ تنخواہ دار طبقہ جو حکو مت کا حامی سمجھا جاتا تھا وہ حکومت سے ناراض نظر آنے لگا۔ بیر ونی ادائیگیوں کے توازن میں خسارے کو کم کر نے کے لئے روپے کی قدر ڈالر کے مقابلے میں کم کی گئی تھی اس کے علاوہ بونس واؤچر اسکیم کا خاتمہ کر دیا گیا۔ پٹرول کی قیمت میں اضافہ ایک پریشان کن مسئلہ تھا مگر خوش قسمتی سے اس دور میں بیرون ملک پاکستانیوں کی اندرون ملکی ترسیلات میں اضافہ دیکھنے میں آیا۔ زراعت اور صنعت کے علاوہ تعلیم اور صحت کے شعبوں میں بھی بڑے پیمانے پر اصلاحات کی گئیں۔ نجی شعبہ میں کام کرنے والے تعلیمی ادارے بھی سر کاری تحویل میں لے لیے

گئے۔ صحت کے شعبے میں دیہی علاقوں میں بنیادی صحت مرکز قائم کرنے کا پروگرام شروع کیا گیا۔ دوائیوں کو برانڈ نام سے فروخت کرنے کی بجائے جینرک نام سے فروخت کرنے کو کہا گیا۔ ان تمام باتوں کے باوجود کچھ منفی پہلو بھی نمودار ہوئے۔ قومی ملکیت کے خوف نے سرمایہ داروں کو مجبور کردیا کہ وہ سرمایہ کاری سے ہاتھ روک لیں۔ زرکی پرواز کے ساتھ تنظیمی صلاحیت کی پرواز بھی دیکھنے میں آئی۔ سرکاری افسران کو بڑے پیمانے پر نکالنے سے اعلی سرکاری افسران بھی حکومت سے ناخوش تھے اور اندرہی اندر فوج بھی حکومت کے بارے میں کچھ تحفظات رکھتی تھی باوجود اس حقیقت کے کہ بھٹو نے پاکستان میں ایٹمی پروگرام کا آغاز کیا تھا۔۳۰

۱۹۷۷ء میں نئے انتخابات کا اعلان کیا گیا تو حزب مخالف کی تمام جماعتوں نے اتحاد کر کے متحدہ جمہوری محاذ کے نام سے انتخاب لڑنے کا فیصلہ کیا۔ حزب مخالف کو حکومت سے یہ شکایت تھی کہ اس نے آزادی رائے کو بے دردی سے سلب کیا ہے اور ذوالفقار علی بھٹو نے کئی مخالفوں کو منظر عام سے ہٹانے کے لئے اپنی قائم کی ہوئی تنظیم ایف ایس ایف (Federal Secretary Force) کی مدد سے قتل تک کیا ہے۔ جب قومی اسمبلی کی دو سو سیٹوں کے نتائج آئے تو پیپلز پارٹی نے ۱۵۴ سیٹیں جیت لی تھیں۔ ان نتائج کو حزب مخالف نے تسلیم کرنے سے انکار کر دیا اور نتائج کے خلاف احتجاج کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ حزب مخالف کو در پردہ فوج کی حمایت حاصل تھی جس نے احتجاج کے سلسلے کو تحریک نظام مصطفے سے بدل دیا۔ بھٹو اور حزب مخالف کے درمیان نئے انتخابات کے حوالے سے سمجھوتہ ہونے والا تھا کہ فوج نے حزب مخالف اور حزب اقتدار کے سرکردہ رہنماؤں کو حراست میں لے کر ملک میں مارشل لاء نافذ کر دیا۔۳۱

فوج کے سربراہ جنرل ضیاء نے بطور مارشل لاء منتظم کے ایک سال کام کیا۔ اس دوران دوبارہ الیکشن کروانے کے وعدے کیے جو پورے نہیں کیے گئے۔ ایک سال کے بعد جنرل ضیاء نے صدر کا عہدہ حاصل کر لیا۔ جنرل ضیاء کے اقتدار کا عرصہ ۱۹۷۷ء تا۱۹۸۸ء ہے جس میں ۱۹۸۵میں جمہوریت کی بحالی کا دور بھی شامل ہے۔ اس عرصہ میں سب سے

زیادہ زور نظام مصطفیٰ کے نفاذ پر دیا گیا۔ یہ کہا گیا کہ ملک کو برطانوی دور کے دیئے ہوئے قوانین کے تحت چلایا جا رہا ہے جو کہ غلط ہے چنانچہ تمام قوانین کو اسلامی شریعت کے مطابق ڈھالنے کی ضرورت ہے۔[۳۲]

حدود آرڈیننس اور نماز کے نظام[۳۳] کے علاوہ زکوٰۃ کی لازمی کٹوتی کو متعارف کروایا گیا معاشی زندگی کے حوالے سے بینکاری نظام کو اسلامی بنانے کی کوشش کی گئی۔ نفع نقصان شراکتی کھاتہ کے ساتھ قرض لینے والوں کے لئے مشارکہ اور مداربہ نام کی اسکیمیں متعارف کروائی گئیں۔ بینکاری کے حوالے سے اس دور میں قرض ناہندگان کا مسئلہ بڑے پیمانے پر سامنے آیا۔ معیشت کے حوالے سے جس اہم بات پر کام کیا گیا وہ بھٹو دور کے قومی ملکیت میں لیے گئے اداروں کی واپسی تھی۔ یہ ادارے بہت فراخدلی سے اصل مالکوں کو واپس کرنے کی پیش کش کی گئی۔ وہ ادارے جو منافع بخش تھے وہ اصل مالکوں نے بخوشی واپس لے لیے لیکن جو ادارے نقصان میں تھے ان کو واپس لینے سے انکار کر دیا۔ چنانچہ ان اداروں کو سرکاری تحویل سے نکالنے کے لیے نجکاری کا آغاز کیا گیا۔ یہ تمام معاملہ تنقید سے ماورا نہیں تھا۔ کچھ لوگوں کے خیال میں کاروباری ادارے اپنے من پسند لوگوں کو اونے پونے فروخت کیے گئے۔[۳۴]

پاکستان کے ایٹمی پروگرام کو جاری رکھنے کی وجہ سے حکومت کو ترقی یافتہ دنیا کی مخالفت کا سامنا کرنا پڑا۔ امریکہ کے صدر جمی کارٹر نے پاکستانی امداد پر پابندی بھی عائدکر دی لیکن یہ مخالفت اور یہ پابندی زیادہ دیر قائم نہ رہ سکی۔ ۱۹۷۹ء میں روس کی فوجیں افغانستان میں داخل ہوگیں اور وہاں کچھ افرادنے اس کے خلاف جہاد کا اعلان کر دیا۔ رفتہ رفتہ جہاد کی حمایت میں اضافہ ہونے لگا۔ مغرب کے سبھی ترقی یافتہ عیسائی ممالک بھی جہاد کی حوصلہ افزائی کرنے لگے۔ ایک تصور یہ تھا کہ یہ جہاد پاکستانی فوج کی مدد سے لڑا جا رہا ہے چنانچہ پاکستان کی دل کھول کر مدد کی گئی۔ اس امداد کی وجہ سے پاکستان کو بیرونی ادائیگیوں کے مسئلہ کو حل کرنے میں مدد مِل گئی۔ ۱۹۷۷ء تا ۱۹۸۶ء کے ضیا دور کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ اوسطاً معاشی ترقی کی سالانہ شرح ۶.۲فیصد رہی۔ اس شرح

کو تسلی بخش کہا جاسکتا ہے۔ اگرچہ یہ وہی دور تھا جب مشرق بعید کے بعض ترقی پذیر ممالک نے تیز رفتار معاشی ترقی کا آغاز کر دیا تھا۔۳۵

ضیاء حکومت کو عالمی سطح پر ایک عجیب مسئلہ کا سامنا بھی کرنا پڑا وہ یہ کہ افغانستان کے حوالے سے حکومت کا موقف یہ تھا کہ وہاں عوام کو اپنی مرضی کی حکومت منتخب کرنے کا حق دیا جائے۔ اس مطالبے کے جواب میں روس کا مؤقف یہ تھا کہ جب پاکستان میں عوام کو حکومت منتخب کرنے کا اختیار نہیں تو وہ کسی اور ملک کے لئے یہ مطالبہ کیسے کرسکتا ہے۔ کچھ عالمی دباؤ اور کچھ ملک میں موجود بحالی جمہوریت کی تحریک کے سبب ۱۹۸۵ء میں انتخابات کروا دیئے گئے لیکن یہ انتخابات غیر جماعتی تھے۔ ملک کی اکثر سیاسی جماعتوں نے ان کا بائیکاٹ کیا۔ محمد خان جونیجو کو جنرل ضیا نے وزیر اعظم نامزد کیا اور غیر جماعتی ایوان سے اسکی منظوری لے لی گئی۔ محمد خان جونیجو ایک کمزور وزیراعظم تھے لیکن اس کے باوجود انہوں نے اچھی کارکردگی کا مظاہرہ کیا۔۳۶

جونیجو نے اقتدار حاصل کرتے ہی ایک پانچ نکاتی ایجنڈے کا اعلان کیا۔ اس میں مساوات پر مبنی معیشت، روزگار کی فراہمی اور بدعنوانی کے خاتمے کے نکات شامل تھے۔ تعلیم پر بھی خصوصی توجہ دی گئی۔ اس دور میں دیہی علاقوں میں سڑکوں کی تعمیر اور بجلی کی فراہمی کو بھی بہت اہمیت دی گئی۔ جونیجو نے اگرچہ مارشل لاء کو ختم کرنے کا وعدہ پورا کیا۳۷ لیکن یہ وعدہ آئین میں آٹھویں ترمیم کے بدلے میں پورا کیا گیا جس کے تحت صدر کو حکومت کی برطرفی کا اختیار حاصل ہو گیا۔ اپریل ۱۹۸۸ء میں اوجڑی کیمپ کے مقام پر اسلحہ کے ذخیرے میں آگ بھڑک جانے کے بعد بہت سا مالی اور جانی نقصان ہوا۔ اسی کو بنیاد بنا کر جونیجو حکومت کو برطرف کردیا گیا۔۳۸ ایک بار پھر غیر جماعتی انتخابات کا وعدہ کیا گیا لیکن اگست ۱۹۸۸ء میں جنرل ضیاء کا طیارہ حادثے کا شکار ہو گیا اور وہ اس حادثے میں دنیا سے رخصت ہوگئے۔

۱۹۸۶ء میں ذوالفقار علی بھٹو کی صاحبزادی بے نظیر بھٹو جلا وطنی ترک کر کے وطن واپس آئیں تو انہیں عوام میں بے پناہ پذیرائی ملی۔۳۹ اس کی وجہ یہ تھی کہ جنرل ضیا نے

ان کے والد کو عدالت کے ذریعے پھانسی دی تھی جس کے بارے میں عوام کا خیال تھا کہ وہ درست فیصلہ نہیں تھا۔ جب جنرل ضیاء کا پراسرار حالات میں اچانک انتقال ہو گیا تو نئی عبوری حکومت نے ۱۹۸۸ء کے انتخابات کو جماعتی بنیادوں پر کروانے کا فیصلہ کیا۔ ان انتخابات کے نتیجے میں بے نظیر بھٹو کی پاکستان پیپلز پارٹی سب سے بڑی جماعت کے طور پر سامنے آئی لیکن وہ پنجاب میں اتنی اکثریت حاصل نہ کر سکی کہ وہاں حکومت بنا سکتی۔ پنجاب میں نواز شریف نے اور مرکز میں بے نظیر نے حکومت بنائی۔[۴۰]

بے نظیر کی آمد نے نہ صرف پاکستان بلکہ دنیا بھر میں بہت سی توقعات کو جنم دیا۔ ان توقعات کے عین مطابق انہوں نے اپنے پہلے خطاب میں بہت سے وعدے کیے لیکن زمینی حقائق ان کے راستے کی دیوار بن گئے۔ نسلی فسادات، پنجاب حکومت کا رویہ، روسی انخلا کے بعد افغانستان کی صورت حال، بھارت کے ساتھ کشیدگی اور عمومی غربت نے مل کر ان کی کارکردگی کے سامنے سوالیہ نشان لگا دیا۔

معیشت کے میدان میں ان کو اس حوالے سے ضرور یاد رکھا جائے گا کہ انہوں نے اپنے والد کا دیا ہوا سوشلزم کا نظریہ اور قومی ملکیت کا تصور ترک کر کے سرمایہ داری نظام کے تحت منڈیاتی معیشت کو اختیار کیا۔ اس نظریہ کے تحت نجکاری کو فروغ دیا گیا اور نجی سرمایہ کاری کے راستے میں موجود رکاوٹوں کو کم سے کم کرنے کی کوشش کی گئی۔ اس زمانے میں عالمی مالی اداروں یعنی عالمی بینک اور عالمی مالیاتی فنڈ پر زرعی معاشئین چھائے ہوئے تھے اور بے نظیر حکومت کی پالیسیاں ان اداروں کے تابع نظر آتی تھیں۔ اس دور میں ان اداروں کے معاشی کردار کو پہلی بار واضح طور پر محسوس کیا گیا۔

خواتین کو معاشی زندگی میں زیادہ حصہ دینے کے حوالے سے بے نظیر نے کچھ کام ضرور کیا لیکن وہ عمومی بے روزگاری اور افراط زر کے مسائل کو حل نہ کر سکیں۔ بے روزگاری کے مسئلہ کو ایک ''پلیس منٹ بیورو'' بنا کر حل کرنے کی کوشش کی گئی جس کے بارے میں یہ تاثر پیدا ہوا کہ وہ صرف اپنی پارٹی کے کارکنوں کو نوازنے کے لئے تھا۔[۴۱] بے نظیر کو اپنے شوہر کی وجہ سے مالی بدعنوانی کے الزامات کا سامنا کرنا پڑا جن میں شاید بہت زیادہ سچائی

نہیں تھی۔ اکتوبر ۱۹۸۹ء میں ان کے خلاف تحریک عدم اعتماد پیش کی گئی جو ناکام ہو گئی لیکن اگست ۱۹۹۰ء میں اس وقت کے صدر غلام اسحاق نے بدعنوانی کے الزامات لگا کر ان کی حکومت برطرف کر دی اور حزب مخالف کے قائد مصطفےٰ جتوئی کو عبوری وزیراعظم بنا دیا۔[۴۲] جب انتخابات کے نتائج آئے تو اسلامی جمہوری اتحاد کو بھاری اکثریت سے کامیابی حاصل ہوگئی اور اس کی سب سے بڑی پارٹی مسلم لیگ کے صدر میاں نواز شریف کو وزیراعظم بنا دیا گیا۔ ان کا وزیراعظم بن جانا اس لحاظ سے اہم واقعہ تھا کہ وہ کسی زمیندار گھرانے کی بجائے ایک صنعتکار گھرانے سے تعلق رکھتے تھے۔[۴۳] پنجاب کے وزیراعلیٰ کی حیثیت سے وہ ہر طرح کے کاروباری طبقے کی ہمدردیاں حاصل کرنے میں کامیاب ہو چکے تھے۔ ان کی آمد کے ساتھ پاکستان پرایک زرعی ملک ہونے کی جو چھاپ لگی ہوئی تھی وہ اتر گئی۔ انہوں نے صنعتی ترقی کے لیے یہ اعلان کیاکہ کسی بھی قسم کی صنعت لگاتے ہوئے حکومت سے پیشگی اجازت لینے کی ضرورت نہیں ہے۔ نجکاری کے حوالے سے انہوں نے اعلان کیا کہ اس میں غیر ملکی سرمایہ کار بھی حصہ لے سکتے ہیں۔ انہوں نے اسٹاک ایکسچینج کو بھی بیرونی سرمایہ کاری کے لیے کھول دیااور زرمبادلہ پرعائد پابندیاں ختم کرکے عوام کو ڈالرمیں یاکسی بیرونی کرنسی میں اکاؤنٹ کھولنے کی اجازت دے دی۔ ان اقدامات کے بعد صنعتی سرمایہ کاری میں تیزی دیکھی گئی۔ بجلی، ہوائی سروس، بحری جہاز کی صنعت اور ٹیلی کام کے شعبوں میں واضح ترقی دیکھنے میں آئی۔[۴۴]

تعمیر وطن پرگرام شروع کرنے کے علاوہ انہو ں نے ایک بلین ڈالر کی لاگت سے ایک موٹروے بنانے کا بھی اعلان کیا۔[۴۵] بے روزگاری کم کرنے کے لیے چھوٹے قرضو ں کے علاوہ پیلی ٹیکسی اوردیگر ٹرانسپورٹ کو آسا ن شرائط پرفراہم کرنے کااعلان کیا گیا۔ سب اچھا والے پہلو کے کچھ ناپسندیدہ پہلو بھی تھے۔[۴۶] امداد باہمی کی انجمنیں اس دور میں دیوالیہ ہوگئیں اور عام خیال یہی تھا کہ ان کو حکومت میں موجود سیاستدانو ں نے دیوالیہ کیا ہے جنھوں نے ان سے قرض لے کرواپس نہیں کیا۔ قرض نادھندگان کا مسئلہ عام بینکوں کے حوالے سے بھی نمایاں ہوا اور اس میں بھی حکومت کے اعلیٰ عہدیداروں کا نام لیا

گیا۔[۴۷] امن و امان کی خراب صورت حال اور نجکاری کے نتیجے میں پیدا ہونے والی بے روزگاری نے حکومتی کارکردگی کے سامنے سوالیہ نشان لگا دیا۔[۴۸] اسی دوران امریکہ نے کویت کے حوالے سے عراق کے خلاف ایک جنگ لڑی جس میں عوام کی ہمدردیاں عراق کے ساتھ تھیں لیکن نواز شریف حکومت نے امریکہ کا یہاں تک ساتھ دیا کہ عراق کے خلاف لڑنے کیلئے اپنے فوجی دستے بھی بھیج دیئے۔ ایک طرف اسلامی جمہوری اتحاد کی کچھ جماعتیں اس سے الگ ہوگئیں اور دوسری جانب آٹھویں ترمیم کے حوالے سے وزیراعظم اور صدر کے درمیان اختلافات پیدا ہوگئے۔ اس موقع پر اپریل ۱۹۹۳ء میں صدر غلام اسحاق نے نواز شریف کی حکومت پر بدعملی اور بدعنوانی کے الزامات لگا کر اس کو برطرف کر دیا۔ نواز شریف نے الزامات کے خلاف سپریم کورٹ سے رجوع کیا اور سپریم کورٹ نے الزامات کو غلط قرار دیتے ہوئے ان کی حکومت کو بحال کر دیا۔[۴۹] تاہم یہ ممکن نہیں رہا تھا کہ وہ اور صدر ساتھ ساتھ چل سکتے چنانچہ ایک معاہدے کے تحت دونوں نے استعفیٰ دے دیا۔

اکتوبر ۱۹۹۳ء میں ہونے والے انتخابات کے نتیجے میں کوئی پارٹی اکثریت تو حاصل نہ کر سکی لیکن ایک بڑی پارٹی ہونے کی حیثیت سے پیپلز پارٹی نے دوسری پارٹیوں کے اشتراک سے مخلوط حکومت بنائی اور محترمہ بے نظیر ایک دفعہ پھر وزیراعظم بن گئیں۔ حزب مخالف نے زبانی طور پر اس فیصلے کو ضرور قبول کیا لیکن دلی طور پر نہیں۔ ایک ماہ بعد ہی حکومت کی کارکردگی پر قرطاس ابیض جاری کر دیا گیا اور کچھ ماہ بعد لانگ مارچ اور پہیہ جام کا اعلان کر دیا گیا۔ کاروباری طبقہ کا غالب حصہ نواز شریف کے لئے نرم گوشہ رکھتا تھا چنانچہ اس نے ہڑتالوں کے پروگرام میں بھرپور شرکت کی۔ یہ رویہ ملک کی معیشت کے لئے نیک شگون نہیں تھا۔ بے نظیر حکومت کو معاشی معاملات میں اس وقت کچھ کامیابی ضرور ملی جب امریکہ نے پہلے سے عائد معاشی پابندیوں میں کچھ نرمی کا اعلان کیا۔ بجلی کا بحران ملک میں ضیاء الحق کے دور سے موجود تھا۔ اس پر قابو پانے کیلئے حکومت نے غیرملکی سرمایہ کاروں کو پاور پلانٹ لگانے کی دعوت دی اور انھوں نے اس میں خاصی دلچسپی لی۔ ملک میں نجی پاور پلانٹ لگنے سے بجلی کچھ مہنگی تو ضرور ہوئی لیکن بجلی کا بحران بھی ختم ہو گیا۔ بینظیر

حکومت تعلیم، غربت کے خاتمے، صحت اور رہائش کے حوالے سے کچھ منصوبے ضرور رکھتی تھی لیکن وہ ان میدانوں میں بہت زیادہ کامیابی حاصل نہیں کرسکی۔ حزب مخالف کے رویے کے علاوہ وزیراعظم اور صدر کے درمیان اختلافات حکومت کے لئے مسئلہ بن گئے۔ اسی دوران وزیراعظم کے بھائی میر مرتضیٰ بھٹو کو پولیس مقابلے کے دوران شہید کر دیا گیا۔۵۰ بدانتظامی اور بدعنوانی کو بنیاد بنا کر۱۹۹۶میں صدر نے حکومت برطرف کردی۔ ایک الزام یہ لگایا گیا کہ حکومت کی نااہلی کی وجہ سے زرمبادلہ کے ذخائر صرف۶۳۰ ملین ڈالر رہ گئے ہیں جن سے صرف ایک ہفتہ کی بیرونی ادائیگی ممکن ہے۔۵۱

جب فروری ۱۹۹۷ء میں نواز شریف نے ایک اور بار بطور وزیراعظم حلف اٹھایا تو ان کی حکومت کے لئے فوری مسئلہ اندرونی اور بیرونی قرض کی ادائیگی تھی۔ ایک اندازے کے مطابق خام ملکی پیداوار کا ۶۵ فیصد قرضوں کا بوجھ اتارنے کیلئے درکار تھا۔ اس موقع پر'قرض اتارو ملک سنوارو' نامی ایک اسکیم کا اجراء کیا گیاجس کے تحت بیرون ملک پاکستانیوں سے بیرونی کرنسی میں اور اندرون ملک پاکستانیوں سے روپے کی شکل میں قرض مانگا گیا۔ عوام نے اس میں بھرپور شرکت کی لیکن نامعلوم وجوہات کی بنا پر اس مد میں جمع ہونے والی رقم کو بجائے قرض اتارنے کے دیگر حکومتی اخراجات پورے کرنے کیلئے استعمال کر لیا گیا۔ اس دوران امن و امان کی بگڑتی ہوئی صورت حال نے حکومت کو مجبور کر دیا کہ وہ معاشی معاملات سے توجہ ہٹاکراس مسئلہ کو اہمیت دے۔ حکومت کے لئے ذرائع آمدن پیدا کرنے کیلئے نجکاری کے عمل میں ان سرکاری اداروں کو فروخت کرنے کا بھی اعلان کردیا گیا جن کو ماضی کی حکومتوں نے سرکاری شعبہ میں قائم کیا تھا۔ مستقبل کیلئے ۲۰۱۰ء کے نام سے ایک معاشی منصوبے کا اعلان کیا گیا لیکن یہ منصوبہ اس وقت مشکلات کا شکار ہو گیا جب ۱۹۹۸ء کے وسط میں ایٹمی دھماکے کر دیئے گئے۔ یہ دھماکے ایک طرح سے پاکستان کو مجبوراً کرنا پڑے۔ اس کی وجہ پہلے بھارت کا ایسے دھماکے کرنا تھا۔ ان دھماکوں کی وجہ سے دنیا کے ترقی یافتہ ممالک نے دونوں ممالک پر اقتصادی پابندیاں عائد کردیں۔ پہلے سے موجود سخت حالات کے اندر پاکستان کے لئے مسائل اور بھی گھمبیر ہوگئے جب آئی ایم ایف اور

عالمی بینک نے بھی مالی معاونت سے معذوری ظاہر کر دی۔ اس موقع پر نواز شریف حکومت نے ایمرجنسی لگا کر زرمبادلہ کے سبھی کھاتوں کو منجمد کردیا۔ اس سے قبل یہ حکومت صدر اور آرمی چیف کو استعفیٰ دینے پر مجبور کرچکی تھی اور چیف جسٹس سپریم کورٹ کو ان کے عہدے سے برخاست کرچکی تھی عوام کی توجہ معاشی مسائل سے ہٹانے کیلئے ایک شریعت بل ایوان سے منظور کروایا گیا۔ ایک طرف نجکاری اور ڈاؤن سائزنگ کی پالیساں بے روزگاری کو فروغ دے رہی تھیں اور دوسری طرف کارگل میں بھارت سے لڑائی شروع ہوگئی۔۵۲

کارگل لڑائی کے حوالے سے فوج اور وزیراعظم کے درمیان اختلاف پیدا ہوگئے۔ وزیراعظم نے فوج کے سربراہ جنرل پرویز مشرف کو برطرف کرنے کی کوشش کی لیکن فوج نے وزیراعظم کوہٹاکرخود اقتدار سنبھا ل لیا۔۵۳ ۱۲راکتوبر ۱۹۹۹ء کو پرویز مشرف نے بطور افسراعلیٰ (Chief Executive) حکومت سنبھالی اور ملک میں ایمرجنسی نافذ کردی۔ کچھ عرصہ بعد انہوں نے صد ر کو ہٹا کر خود صدر کا عہد ہ سنبھال لیا۔ فوری انتخا بات کی بجائے تین سال کے عرصہ میں انتخابات کا وعدہ کیا گیا۔۵۴

۲۰۰۱ء اس لحاظ سے تاریخ میں ہمیشہ یا د رکھا جائے گا کہ اس سال گیارہ نومبر کوامریکہ کاورلڈٹریڈ سنیٹردہشت گردی کی ایک کاروائی میں تباہ ہو گیا۔ امریکہ نے دہشت گردی کے خلاف جنگ کا اعلان کردیااور پاکستان سے تعاون طلب کیا۔۵۴ اس تعاو ن کے بدلے نہ صرف ایٹمی دھماکوں کی وجہ سے عائد پابندیاں اٹھا لی گئیں بلکہ پاکستان کی امداد میں اضافہ کر دیا گیا۔ مغربی دنیا میں کام کرنے والے پاکستانی شہریوں کو یہ خطرہ پیدا ہوا کہ کہیں اُن کے اثاثے منجمد نہ کردیئے جائیں چنانچہ انہوں نے اپنا زرمبادلہ پاکستان منتقل کرنا شرو ع کر دیا۔ پاکستان کے زرمبادلہ کے ذخائر میں تیزی سے اضافہ ہونے لگا جنھوں نے بیرونی ادائیگی کے مسئلہ کوحل کرنے میں اہم کردار ادا کیا۔

نومبر ۲۰۰۲ء میں انتخابات ہوئے جس میں کوئی سیاسی پارٹی واضح اکثریت حاصل نہ کر سکی۔ مسلم لیگ کے ایک دھڑے جس کا نام قائد اعظم مسلم لیگ تھا ، نے دوسری سیاسی پارٹیوں کی مدد سے حکومت بنائی۔ ابتداء میں ظفراللہ جمالی کو وزیراعظم بنایا گیا لیکن پھر

مشرف دور کے وزیر خزانہ شوکت عزیز کو وزیراعظم بنا دیا گیا۔ شوکت عزیز ایک کامیاب بینکار کی حیثیت سے شہرت رکھتے تھے چنانچہ انہوں نے بینکاری کی بحالی پر خصوصی توجہ دی۔ شرح سود کو کم کرنے، بیرون ملک سے آنے والی رقوم نے اور صرفی قرضہ کے فراخدلانہ اجراء نے مل کر بینکاری کو ایک منافع بخش کاروبار میں بدل دیا۔۵۵

اس دوران غیر ملکی سرمایہ کاری میں بھی خاطر خواہ اضافہ ہوا۔ ۱۹۹۹ء میں براہ راست بیرونی سرمایہ کاری ایک بلین ڈالر تھی جو ۲۰۰۷ء میں ۸ بلین ڈالر ریکارڈ کی گئی۔ اسکے علاوہ آئی ٹی، ٹیلی کام، ٹرانسپورٹ، سی این جی، اے سی اور تعمیرات کی صنعتو ں میں واضح ترقی دیکھنے میں آئی۔ شوکت عزیز کے دور میں ترقی کی سالانہ شرح ۶ تا ۷ فیصد رہی۔ زرمبادلہ کے ذخائر جو ۱۹۹۹ء میں صر ف ۷۰۰ ملین ڈالر تھے بڑھ کر ۱۴ بلین ڈالر ہوگئے۔ کراچی اسٹاک ایکسچینج کا انڈیکس جو ۱۹۹۹ء میں سات سو پوائنٹ اتنا بڑھ کر چودہ ہزار پوائنٹ ہو گیا۔ قرض کی ادائیگی جو ۱۹۹۹ء میں خام ملکی پیداوار کا ۶۵ فیصد تھی پیداوار میں اضافے کی وجہ سے خام ملکی پیداوار کا ۲۶ فیصد رہ گئی۔ اس عرصے میں پاکستان کی فی کس آمدنی بھی ۱۰۰۰ ڈالر سالانہ کی نفسیاتی حد عبور کر گئی۔ ڈالر کے مقابلے میں روپے کی قدر میں استحکام اور افراط زر کی دس فیصد سے کم شرح اس حکومت کی دو اور کامیابیاں تھیں۔۵۶

کامیابیو ں کے ساتھ اس حکو مت کی کچھ ناکامیاں بھی تھیں۔ ان میں بے روزگاری اور آمدنی کی تقسیم میں خرابی سرفہرست تھیں۔ دیہی آبادی، جوکہ ملک کی کل آبادی کا ۶۰ فیصد تھی، کی ترقی پر کوئی خصوصی توجہ نہیں دی گئی حکومت کے بالکل آخری حصے میں دیہاتوں میں بجلی کی فراہمی اور سڑکیں بنانے کی کوششیں کی گئی۔ حکومت کے بدلنے سے سڑکوں کا کام موخر ہو گیا اور بجلی کی فراہمی بھی بجلی کا بحران پیدا ہونے سے رک گئی۔ اکتوبر ۲۰۰۵ء میں آنے والے زلزلے نے بھی حکومت کے لئے بحالی کا بہت بڑا مسئلہ پیدا کر دیا۔ ایک اندازے کے مطابق اس زلز ے میں ڈھائی لاکھ لوگ بے گھر ہوئے اور پچھتر ہزار لوگ موت کے منہ میں چلے گئے۔ اس حوالے سے حکومت کو ۱۰۱ بلین ڈالر کی رقم خرچ کرنا پڑی، خراب امن و امان کے ساتھ امریکی حکومت کی حمایت، آٹے کے بحران اور پٹرول کی

بڑھتی ہوئی قیمت نے مل کر حکومت کی ساکھ کو بری طرح متاثر کیا۔ جب فروری ۲۰۰۸ء میں نئے انتخابات ہوئے تو حکمران جماعت کو شکست کا سامنا کرنا پڑا۔

حاصلِ بحث

اگر ہم تمام سالوں کو سامنے رکھ کر معاشی ترقی کا جائزہ لیں تو ہم دیکھتے ہیں کہ ۱۹۴۷ء سے مختلف حکومتوں کی یہ کوشش رہی کہ اس ملک سے غربت کا خاتمہ ہو جائے، حکومتیں تو ختم ہوتی رہیں پر غربت ختم نہ ہو سکی۔ ہم دیکھتے ہیں کہ پاکستان کو مسلسل درج ذیل مسائل کا سامنا رہا۔

ا۔ افراط زر کی بلند شرح	ب بے روزگاری
ج۔ دولت کی تقسیم میں عدم توازن	د۔ بیرونی قرض کا بڑھتا ہوا بوجھ
ر۔ بیرونِ ادائیگی کے توازن میں خسارہ	س۔ پٹرول کی قیمتوں میں مسلسل اضافہ
ش۔ بجلی کی لوڈ شیڈنگ	ص۔ ہنرمند افراد کی کمی
ض۔ سمگلنگ اور ذخیرہ اندوزی	ط۔ حکومتی اور نجی بد عنوانی
ظ۔ افراط آبادی	ع۔ سست رفتار تعلیمی ترقی
غ۔ قومی بچت کی سکیم میں کم سے کم اضافہ	ف۔ وقفے وقفے سے ناگہانی آفات
ق۔ بے قابو بجٹ خسارہ	ک۔ روپے کی گرتی ہوئی قدر قیمت

اس عرصہ میں حکومت کو عوام سے شکایت رہی کہ وہ ٹیکس ٹھیک طور پر ادا نہیں کرتے جبکہ عوام کو شکایت رہی کہ انھیں بے شمار بلا واسطہ اور بلواسطہ ٹیکسو ں کے بوجھ تلے دفن کیا جا رہا ہے۔ اگر ہم گزشتہ تیس سال میں دیکھیں تو سبھی حکومتوں کا آزاد معیشت کو فروغ دینے پر اتفاق رہاہے اور اس حوالے سے نجکاری کے عمل کو خصوصی اہمیت دی جاتی رہی ہے۔ آزاد معیشت کا تجربہ ہو سکتا ہے کہ کئی اور ممالک میں بہت کامیا ب رہا ہو لیکن پاکستان میں اس کو جزوی طور پر ہی کامیاب کہا جاسکتا ہے کیونکہ ہمارے اکثر مسائل پہلے کی طرح موجود ہیں۔ سچ تو یہ ہے کہ جن ممالک نے عالمی بینک اور عالمی مالیاتی ادارے کے

مشوروں پر عمل کیا وہ ترقی کی دوڑ میں پیچھے رہ گئے اور جن ممالک نے ان اداروں کے مشوروں کو نظر انداز کر کے آزادانہ فیصلے کیئے وہ ترقی کی دوڑ میں آگے نکل گئے۔

اگر ہم ضیاء، بے نظیر، نواز شریف اور پرویز مشرف کے دور میں ہونے والی نجکاری کا جائزہ لیں تو ایک بھی ادارے کی فروخت تنقید سے آزاد نہیں تھی۔ عام تاثر یہی ہے کہ سرکاری ادارے من پسند لوگوں کو اونے پونے فروخت کیئے گئے۔ ویسے بھی ایسے ملک میں نجکاری کیسے کامیاب ہو سکتی ہے جہاں سرمایہ کی منڈی اور سٹاک مارکیٹیں بہت محدود ہوں۔ اگر نجکاری کا مقصد مقابلے کی فضا پیدا کرنا تھا تو یہ مقصد بھی حاصل نہیں ہوسکا۔ اکثر یہ ہوا کہ سرکاری اجارہ داری کی جگہ نجی اجارہ داری یا چند اجارہ داروں نے لے لی۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ فلاح کے مقصد کو بھلاکر منافع کا مقصد سامنے رکھ لیا گیا۔ عوام کو اس کا خمیازہ بڑھتی ہوئی قیمتوں کی صورت میں برداشت کرنا پڑا۔

ایوب دور کے ۲۲ امیر خاندان بڑھ کر شاید ۲۲۰ ہوچکے ہیں لیکن اب اکثر سرمایہ دار بے شکل اور بے نام ہیں کبھی کبھار کسی مالی سکینڈل کے حوالے سے کچھ نام سامنے آجاتے ہیں۔ مختلف وقتوں میں حکومتیں عام آدمی سے بچوں کی تعلیم کا خرچ، بجلی اور گیس کا خرچ پوچھتی رہی ہیں لیکن کبھی کسی سے یہ نہیں پوچھا گیا کہ اس کے نام پر کتنی ملیں ہیں یا اس کا نام کتنی کمپنیوں کے بورڈ آف ڈائریکٹرز میں شامل ہے۔ اسی طرح زرعی زمین کی ملکیت کے حوالے سے بھی کچھ نہیں پوچھا گیا۔ سرمایہ کاروں کیلئے تو ہر بجٹ میں کئی مراعات موجود ہوتی ہیں لیکن صارفین کے مفاد کو کوئی تحفظ فراہم نہیں کیا جاتا۔ اشیاء کی قیمتوں اور معیار کے حوالے سے کوئی خاص کنٹرول موجود نہیں ہے۔ جھوٹے اشتہاروں یا انعام کے لالچ کے ذریعے عوام کو کم معیار کی اشیاء مہنگے داموں فروخت کی جاتی ہیں۔ ایک ہی بازار میں ایک چیز کی قیمت مختلف دکانوں پر مختلف بتائی جاتی ہے۔

اب تک جو کچھ بیان کیا گیا وہ بہت پریشان کن ہے لیکن شائد جن مسائل کا پاکستان کو سامنا ہے وہ دنیا کے اکثر ترقی پذیر ممالک میں موجود ہیں۔ ہمیں اپنا موازنہ ترقی یافتہ ممالک سے کرنے کی بجائے اپنے جیسے ترقی پذیر ممالک سے کرنا ہوگا۔ اس حوالے

سے ہماری معاشی کارکردگی بہت شاندار نہیں رہی ہے تو بہت خراب بھی نہیں رہی ہے۔ آزادی کے وقت زراعت اس ملک کا سب سے بڑا شعبہ ہی نہیں بلکہ واحد شعبہ تھا لیکن اب ایسا نہیں ہے۔ صنعتی شعبہ، خدمات کے شعبہ، تعمیر کے شعبہ میں ترقی کے بعد خام ملکی پیداوار میں زراعت کا حصہ صرف ۲۰ فیصد رہ گیا ہے۔ خاص طور پر خدمات کا شعبہ جس میں تجارت بھی شامل ہے اسکا حصہ خام ملکی پیداوار میں ۵۳ فیصد ہے۔

گولڈ مین انویسٹمنٹ بینک نے ۲۰۰۵ء میں ''اگلے گیارہ کے نام'' سے گیارہ ایسے ملکوں کے نام جاری کئے تھے جو جلد ترقی یافتہ ممالک کی فہرست میں شامل ہوسکتے ہیں۔ ان میں سے دو ترکی اور جنوبی کوریا اس دوران یہ مرحلہ طے کر چکے ہیں اور باقی نو ہیں۔ پاکستان کا نام بجائے ویت نام اور نائیجیریا کے ساتھ لیے جانے کے ایران اور انڈونیشیا کے ساتھ لیا جاسکتا ہے جن کی کامیابی کے امکانات زیادہ ہیں۔ پاکستان کا جغرافیائی محل وقوع ایسا ہے جو اس کو دنیا کی چند بڑی بڑی منڈیو ں کی قربت عطا کرتا ہے۔ مثلاً مشرق وسطیٰ، وسطی ایشیا کی ریاستیں، بھارت اور چین وغیرہ۔ اگر ہمیں بھارت کے ساتھ جنگیں نہ لڑنی پڑتیں یا کبھی افغان جہاد اور کبھی دہشت گردی کی جنگ میں حصہ نہ لینا پڑتا تو ہمارے معاشی حالات یقیناً بہت بہتر ہو سکتے تھے۔

حوالہ جات

1- Aitzaz Ahsan, The *Indus Saga and The Making of Pakistan,* Karachi, Royal Book Company, 2003, pp. 339-340.

2- G.M. Bongard-Levin, *Mauryan India,* New Delhi, Starling Publishers Private Limited, 1985, p. 319.

۳- فیضان احمد شیخ اور ذکاء الدین چودھری، *تاریخ ہند و پاکستان*، سیالکوٹ، شاہ اینڈ سنز، ۱۹۵۷ء، ص ص ۳۰۱-۲۹۹۔

4- Richard Symond, *The Making of Pakistan,* London, Faber and Faber, 1949, p. 20.

5- Jawaharlal Nehru, *Glimpses of World History,* Bombay, Asia Publishing House, 1967, p. 423.

6- Ibid., pp. 435-436.

7- Ian Stephen, *Pakistan Old Country New Nation*, Middlesex, Panguin Books Ltd., 1964, pp. 83-84.

۸- محمد علی چراغ، تاریخ پاکستان، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۱۹۸۷ء، ص ۲۴۴۔

۹- ایضاً۔

10- Muhammad Zafrulla Khan, *The Agony of Pakistan*, Oxford, Kent Publication, 1974, p. 110.

11- Chaudhri Muhammad Ali, *The Emergence of Pakistan*, Lahore, Service Book Club, 1988, p. 267.

12- Ibid., p. 265.

13- Ibid., p. 276.

14- Ibid., p. 276.

15- Ibid., p. 350.

16- Ibid., p. 344.

17- Noor Fatima, *Debt Dependence Role of IMF and World Bank in Pakistan's Economy (1947-1998)*, Islamabad, Profile Printing, 2012, p. 40.

۱۸- چودھری محمد علی، ایمرجنسی آف پاکستان، ص ۳۴۴۔

۱۹- نور فاطمہ، حوالہ سابقہ، ص ۴۴۔

۲۰- محمد علی چراغ، حوالہ سابقہ،ص ص ۵۲۳-۵۲۲۔

۲۱- محمد علی چراغ، ص ص ۵۲۷-۵۲۳۔

۲۲- طاہر کامران، پاکستان میں جمہوریت اور گورننس، لاہور، ساؤتھ ایشیاء پارٹنر شپ، ۲۰۰۸ء، ص ۵۷۔

23- Aysha Jalal, (ed.), *The Oxford Companion of Pakistani History*, Karachi, Oxford University Press, 2012, p. 130.

24- Ian Talbot, *Pakistan: A Modern History*, New Delhi, Foundations, 2005, p. 151.

25- Ibid., p. 189.

26- Ibid., p. 212.

27- Stanley Wolpert, *Zulfi Bhutto of Pakistan His Life and Times*, Karachi, OUP, 1993, pp. 180-181.

28- Mahbobul Haq, *Planned Capital Formation in Underdeveloped Economy. The Case of Pakistan*, Michigan Yale University, Ph.D., thesis, 1965.

29- Stanley Wolpert, p. 233.

30- Rafi Raza, Zulfikar Ali Bhutto and Pakistan, 1967-77, Karchi, OUP, 1997, pp. 285-288.

31- Ibid., pp. 277-278.

32. K.M. Arif, Working with Zia: Pakistan Power Politics 1977-1988, Karachi, OUP, 1996, p. 133-134.

۳۳- محمد علی چراغ، حوالہ سابقہ، ص ۶۵۹۔

۳۴- نور فاطمہ، Debt Dependence، حوالہ سابقہ، ص ۹۰۔

۳۵- ایضاً، ص ۹۴۔

۳۶- کے۔ایم۔عارف، حوالہ سابقہ، ص ۲۳۵۔

۳۷- ایضاً،ص ۲۳۶۔

۳۸- ایضاً، ص ۳۹۱۔

39- Benazir Bhutto, *Daughter of the East An Autobiography,* London, Hamish Hamilton, 1988, p. 276.

40- Muhammad Ali Shaikh, *Benazir Bhutto A Political Biography,* Karachi, Orient Books Publishing House, 2000, . 133.

۴۱- ایضاً،ص ۱۵۵۔

42- Sadiq Jafri, *Benazir Bhutto on Trial,* Lahore, Jang Publishers, 1993, pp. 262-264.

43- Mushtaq Ahmad, *Sharif Politics of Business,* Karachi, Royal Book Company, 2001, p. 119.

۴۴- مشتاق احمد، ایضاً، ص ۱۲۰۔

۴۵- ایضاً۔

۴۶- ایضاً، ص ۱۴۳۔

۴۷- ایضاً، ص ۱۴۶۔

۴۸- ایضاً، ص ۱۴۷۔

۴۹- محمد فاروق قریشی، ایک حکمران ایک سیاستدان، لاہور، قومی پبلشرز، ۱۹۹۴ء، ص ۴۰۲۔

۵۰- محمد علی شیخ، حوالہ سابقہ، ص ص ۲۱۴-۲۲۶۔

۵۱- زاہد علی حسین انجم، ایڈیشن ۱۹۹۷ء، لاہور، نذیر سنز پبلشرز، ۱۹۹۷ء، ص ۳۔

52- Aysha Jalal (ed.), *The Oxford Companion to Pakistan History,* Karachi, OUP, 2012, p. 470.

53- Shireen Mazari, *The Kargil Conflict 1999,* Islamabad, Institute of Strategic Studies, 2003, p. 106.

54- Pervez Musharraf, *In the Line of Fire: A Memoir,* London, Simon and Schuster, 2006, p. 167.

۵۵- پرویز مشرف، ایضاً، ص ۱۴۵۔

۵۶- ایضاً، ص ص ۱۸۷-۱۹۲۔

۵۷- ایضاً، ص ص ۳۲۲-۳۲۳۔